الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری میں تنوع کے رجحانات

Trends of Diversity in Altaf Fatima's Fiction Writing

ڈاکٹر آمنہ رفیق*

Abstract:

There is undoubtedly a considerable amount of research available regarding Altaf Fatima's short story writing; however, her two books that came to light towards the end of her life, "Gawahi Aakhir-e-Shab Ki" and "Deed wa Deed," demand special attention and research. The stories in these books incarnate various shades. The trends of diversity in her short stories are clearly evident in these collections. Topics such as the partition of Subcontinent, Indian society, culture, social and psychological issues, class entanglements, global and economic discussions, the violation of values, the lust for wealth, moral decline, family issues, modern technology, and political scenarios are included in these collections, along with some personal sketches and memories that belong to her family. These stories are a proof of Altaf Fatima's intellectual and literary insight due to their diverse trends. These stories, apart from being based on reality, carry the fundamental observations and personal experiences of Altaf Fatima. In these stories, her art of short-story writing is seen at its peak, and these stories undoubtedly unveil many layers of Altaf Fatima's personality and the era, which are discussed in this paper.

(الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری کے حوالے سے بلاشبہ بہت سا تحقیقی کام موجود ہے لیکن آخرِ عمر میں منظرِ عام پر

*اسسٹنٹ پروفیسر، دی یونیورسٹی آف لاہور

آنے والی ان کی دو کتابیں "گواہی آخرِ شب کی" اور "دید وادید" خاص توجہ اور تحقیق کی متقاضی ہیں۔ مذکورہ کتب میں موجود افسانے اپنے اندر مختلف رنگ لئے ہوئے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری میں تنوع کے رجحانات ان مجموعوں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ تقسیمِ ہند، ہندوستانی معاشرت، تہذیب، سماجی و نفسیاتی مسائل، طبقاتی الجھنیں، عالمی و اقتصادی بحثیں، اقدار کی پامالی، ہوسِ زر، اخلاقی زوال، خاندانی مسائل، جدید ٹیکنالوجی، سیاسی منظر نامے کے علاوہ ان مجموعوں میں چند شخصی خاکے اور خاندانی یادوں کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ یہ افسانے اپنے متنوع رجحانات کے باعث الطاف فاطمہ کی علمی و ادبی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ افسانے حقیقت پر مبنی ہونے کے علاوہ الطاف فاطمہ کے بنیادی مشاہدات اور تجربات کے حامل ہیں۔ ان افسانوں میں ان کا فن افسانہ نگاری اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور یہ افسانے بلاشبہ الطاف فاطمہ کی ذات اور عہد کی بہت سی پرتیں وا کرتے ہیں جن کا تذکرہ اس مقالے میں کیا گیا ہے۔)

کلیدی الفاظ: الطاف فاطمہ، افسانہ نگاری، متنوع رجحانات، گواہی آخر شب کی، دید وادید

الطاف فاطمہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ افسانہ نگاروں کی ایسی نسل سے تعلق رکھتی ہیں جنہوں نے روایت سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے جدید طرز کے تحت افسانے تحریر کئے۔ ان کے افسانے زندگی کی اصل، تحرک آمیز اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کا گہرا مشاہدہ ایک چھوٹے سے نکتے کو کمال فن اور شدت احساس سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ان کی فکر ایک کامیاب افسانے کی بنیاد بنتی ہے۔

الطاف فاطمہ کے مندرجہ ذیل افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آئے:

- وہ جسے چاہا گیا
- جب دیواریں گریہ کرتی ہیں
- تارِ عنکبوت
- دید وادید
- گواہی آخرِ شب کی

"گواہی آخرِ شب کی" ان کی وفات کے وقت اشاعتی مراحل میں تھا۔ اس سے پہلے شائع ہونے والا ان کا افسانوی مجموعہ "دید وادید" ان افسانوں پر مشتمل ہے جو الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ گم گشتہ افسانے وہ ہیں جنہیں بہت کوششوں کے بعد حاصل کیا گیا۔

''دید وادید'' میں ۲۴ افسانے سامنے ہیں:

۱۔	سانکھیایوگی	۲۔	بدل گیا
۳۔	دیدوادید	۴۔	چکی
۵۔	روشنی، ہوااور پانی	۶۔	سوم رس
۷۔	چمچہ کے بغیر	۸۔	بیر بہوٹی
۹۔	اگیابیتال	۱۰۔	تکرارِ تمنا
۱۱۔	خدیجہ، پانڈااور بامبو گھاس کے قطعات	۱۲۔	قالین بُننے والے
۱۳۔	سون گڑیاں	۱۴۔	گئے دنوں کا سراغ
۱۵۔	پالتو	۱۶۔	بسیرے کی وہ شب تھی
۱۷۔	صبر	۱۸۔	کانسی کی جل پری
۱۹۔	کنڈ کٹر	۲۰۔	اصحابِ تحیر
۲۱۔	چھوٹا	۲۲۔	مہرہ جو پٹ گیا
۲۳۔	رنجِ سفر	۲۴۔	نیا گوتم

یہ افسانوی مجموعہ ۲۰۱۷ء میں پہلی بار شائع ہوا اور ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے یہ کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔ اس کا دیباچہ بھی مصنفہ سے تحریر کیا ہے جس میں انہوں سے اپنے افسانوی مجموعوں کی تشہیر و اشاعت سے رشتہ توڑے رکھنے کا اعتراف کیا ہے۔

> ''اس سے قبل میرے تین افسانوی مجموعے 'وہ جسے چاہا گیا'، 'تارِ عنکبوت' اور 'جب دیواریں گریہ کرتی ہیں' out of print رہے، ایک عرصے تک، میں نے تردد یوں نہ کیا کہ میں سمجھتی تھی کہ بہ وجوہ ان کا یہی انجام ہونا تھا، سو میں نے بھی تشہیر و اشاعت، تنقید و تبصرے کی دنیا سے رشتہ توڑ لیا تھا، یہ سوچ کر کہ
>
> اب سینکڑوں بل کھائی جا، میری بلا سے''(۱)

اس مجموعے میں ان کے چار افسانے گزشتہ مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں جن میں کنڈ کٹر، مہرہ جو پٹ گیا، رنجِ سفر اور نیا گوتم شامل ہیں۔

الطاف فاطمہ کے فنی سفر میں ان افسانوں کی اس لئے بھی اہمیت ہے کہ یہ متنوع موضوعات پر ہندوستان کی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں ان کا تعلق لکھنؤ شہر کی معاشرت سے تھا اور

لکھنؤ کے تمدن اور تہذیب کے مختلف زاویوں کا رچاؤ ان کے ان افسانوں کی بنت میں موجود ہے۔ اگرچہ ان کا مزاج انسانی زندگی کی باریکیوں میں دلچسپی لینے سے تعلق رکھتا ہے، اس کے ساتھ ہی ان کا مشاہدہ اشرافیہ کی زندگی کے گھریلو اور مجلسی پہلوؤں سے زیادہ سروکار کرتا ہے۔ اس لئے ان افسانوں کا بیانیہ حقیقت پسندانہ بھی ہے اور کہانی کے روایتی پیرائے سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ الطاف فاطمہ کی گہری نظر ہندوستان میں بدلتے ہوئے سیاسی منظرنامے پر بھی رہتی ہے اور ان کے اثرات افراد اور ان کے افعال پر بھی جس طرح ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح انہوں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ الطاف فاطمہ کا زمانہ کم و بیش وہی ہے جو ہندوستان کی تقسیم کے وقت بے شمار ادیبوں کا ہے جن میں انتظار حسین، قرۃ العین حیدر اور دیگر ہم عصر لکھنے والے موجود تھے۔ اس لحاظ سے الطاف فاطمہ کا تعلق لکھنؤ کے پڑھے لکھے خاندان سے تھا جس نے تعلیم اور تہذیب کی دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ اس لئے ان کے موضوعات بھی تعلیم یافتہ طبقوں کے مسائل اور مباحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے دیباچے میں وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''انہی دنوں میں مجھے اپنے ملک کے ایک حقیقت پسند اور تقریباً ناکام سیاست دان کا ایک فقرہ بہت بھلا لگا حرزِ جان بنالیا 'مٹی پاؤ' سو میں نے اس فقرے کو چراغِ راہ جان کر ہر چیز اور ہر راہ پر مٹی پانے کا طریقہ اختیار کر لیا۔ اس طریقہ عمل سے ذرا چین سا تو آیا گویا میرؔ کی زبان میں تسلی دیتا ہو
>
> آنکھوں کے مند گئے پر آرام سا تو آیا''(۲)

ان افسانوں میں کئی طرح کی تبدیلیاں سماجی سطح سے اخلاقی سطح تک دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار تقسیم کے نتیجے میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر ہونے والی شکست و ریخت کو کئی زاویوں سے دیکھتے رہے ہیں۔ الطاف فاطمہ کے ہاں بھی اس کے کئی پہلو دیکھے جا سکتے ہیں۔ جیسے ان کے افسانے 'بدل گیا' میں بدلتے ہوئے کاروباری سماج کی ایک جھلک ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ ہونے والی مختلف تبدیلیوں میں سے ایک تبدیلی کی طرف بہت تفصیل سے سماجی اور نفسیاتی تناظر میں الطاف فاطمہ نے اپنے تجربے کی بنیاد پر حقیقت پسندانہ تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ الطاف فاطمہ کے یہ افسانے وسیع تناظر رکھتے ہیں اور یہ اس دور کو سامنے رکھتے ہوئے سیاسی، عالمی، اقتصادی، سماجی اور تاریخی سطحوں پر کئی بحثوں کو جنم دیتے ہیں۔ الطاف فاطمہ کا کہانی کھولنے کا انداز بے ساختہ ہوتا ہے اور پھر کہانی بُنتے ہوئے مکالمے، تخاطب اور خود کلامی کے ملے جلے پیرائے کے ساتھ ہر طرح کے مسئلے کے تار

ایک ایک کر کے اس بُنت میں شامل کرتی چلی جاتی ہیں۔ لکھنؤ کی زندگی کا تجربہ جس میں تعلیمی زندگی کے ساتھ ساتھ سماجی نوعیت کی روزمرہ زندگی کے وابستہ مسائل کا بیان بھی دلچسپی لئے ہوئے ہوتا ہے۔

''گھر پہنچا تو انہوں نے اسے مشورہ دیا کہ 'شاعری ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتی ذکی میاں۔ بات یہ ہے کہ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ افسانہ لکھنے لگو۔ افسانہ جو ہے نا۔۔۔ اس میں معروضیت۔۔۔ خیر یہ الگ بحث ہے۔''(۳)

الطاف فاطمہ کا زمانہ دنیا بھر میں تحریکوں، نظریات کی اُتھ پتھل، سماجی ناہمواری، سماجی تبدیلی اور بحثوں کا زمانہ ہے۔ اس پر ہندوستان کی تقسیم سے پہلے اور بعد کے اثرات نے ان کے افسانوں کا کینوس بہت وسیع کر دیا۔ وہ خود بھی لکھنؤ کی پڑھی صاف سنائی دیتی ہیں۔ کچھ اثر قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی کا بھی اس نسل پر رہا ہے۔ اس لئے ان افسانوں میں جو بھی تفاصیل دی گئی ہیں ان کا تعلق انہیں مسئلوں اور بحثوں سے رہا ہے۔ جیسے افسانہ 'گئے دنوں کا چراغ' میں اس دور کی سیاسی گونج صاف سنائی دے رہی ہے۔

''وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ پنڈت نہرو نے جو یونیورسٹی کے نام سے مسلم کا لفظ نکال دینا اور ان کے جی کا زیاں کر دینا ہے، اب اس کی تلافی علی گڑھ والوں کے درمیان رہ کر ہی ہو سکتی ہے۔ پر وہاں تو نقشے ہی دوسرے تھے۔''(۴)

اطلاف فاطمہ کا بیانیہ سادہ ضرور ہے مگر اس میں ان کا تجربہ، علم اور گہری سوچ اس طرح رچی بسی ہوتی ہے کہ تحریر کا جادو اپنی جگہ خود بنالیتا ہے۔ انہیں زندگی اور اس کی بصیرت سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں بہت لطف ملتا ہے۔ لکھنؤ اور پھر پاکستان میں بھی زنگی کا چلن بہت سے نشیب و فراز اور اضطراب لئے ہوئے تھا۔ الطاف فاطمہ خاموش تماشائی کبھی بھی اپنے فکشن میں نہیں رہیں۔ انہوں نے ہر بار طنز اور چھیڑ چھاڑ کا سہارا لیتے ہوئے کچھ نہ کچھ تجزیہ نما بیان داغنے کی ضرور کوشش جاری رکھی ہے۔

''سردی سے زیادہ قدموں تلے بہتے کیچڑ پانی نے حیران کر رکھا تھا اور یوں سارے مضبوط ارادوں کے فسق ہو جانے پر اب میں نے اپنا رخ بائیں جانب سے دائیں کو موڑ لیا ہے، جہاں سے تقریباً بائیس قدم چل کر آپ مرغیوں کے 'مقتل' تک پہنچ جاتے ہیں۔''(۵)

الطاف فاطمہ کے یہ افسانے کچھ تو ان کے لکھنؤ کے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں اور کچھ ان کے ہجرت کے تجربے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی لکھنے پڑھنے اور خاندان کے افراد کی دلچسپیوں میں گزری۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں خاندانی دلچسپیوں کے خوبصورت مرقعے، زندگی کی گہما گہمی اور شگفتگی کے

پہلوؤں سے بھرپور ہیں۔ ان افسانوں کا داخلی ماحول بے حد زندگی آمیز ہے۔ الطاف فاطمہ کے ہاں کسی بھی قسم کی نارسائی اور اداسی کا تصور موجود نہیں ہے۔ اب دیکھیں قیام پاکستان کے حوالے سے جو انداز اختیار کیا گیا ہے، اس میں بھی زندگی آمیز پہلو موجود ہے۔

> ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے تو پاکستان بننے کی خبر سرسری طور پر سنی اور سرسری ہی کہا تھا 'نت نت جم جم بسے۔ شاد رہے۔ آباد رہے (ابھی نہ حفیظ جلندھری نے ترانہ کہا تھا اور نہ ہی یہ بول ان کے کانوں میں پڑے تھے مگر وہ اپنے طور پر شاد باد کہہ گزرے تھے) بن گیا ہے تو بنا ہی رہے پر ہم کو کیا۔ ہمیں کون سا وہاں جا کر تاج و تخت سنبھالنا ہے۔''(۶)

الطاف فاطمہ اپنے خاندانی پس منظر کے مکمل احساس کے ساتھ اپنے افسانوں میں پوری ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر طرح کے مسائل کا ادراک رکھتی ہیں۔ ان کے سگے ماموں سید رفیق حسین اردو کے ایسے افسانہ نگار ہیں کہ جن کے افسانوں میں انسانوں کے معاشرے کے لئے جنگل اور حیوانوں کے معاشرے کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ ایسی کہانیاں اردو کو دوبارہ نصیب نہیں ہوں گی۔ اس لئے الطاف فاطمہ کا بیانیہ موثر ہونے کے ساتھ دنیا میں ہونے والی ہر طرح کی تبدیلیوں کی خبر رکھتا ہے۔ اس دور کے فکر و فلسفہ، عمرانیات، سیاسیات اور تاریخی مدوجزر پر ان کی گہری نظر ہے۔ جس کی وجہ سے یہ فکشن ہمارے شعور کے لئے ایک تحریک کا کام بھی دیتا ہے۔

> ''وقت کے ناہموار کوہانوں پر لدے ہوئے قافلے دھیرے دھیرے ہزاروں سال کے بکھرے ہوئے راستوں پر نکل گئے۔ عہد بہ عہد کے قدیم آریہ اپنی اقدار کی ارتھیاں اپنے کاندھوں پر اٹھائے سر جھکائے گزرتے چلے گئے۔ اور سخت جانوں کو کبھی موت نہیں آتی۔ اس نے سوچا اور بڑی آس لئے اس کنارے پر پڑی بوتل کو دیکھا تھا۔''(۷)

ان افسانوں میں پاکستان میں ہجرت کے بعد کی افراتفری اور اشرافیہ کے لئے محفوظ مقام حاصل کرنے کی جدوجہد لے کر ایک اور ہجرت تک کی روداد موجود ہے۔ پاکستان کے بعد اگلی ہجرت یورپ اور امریکہ تک کی گونج ان افسانوں میں موجود ہے۔

> ''کس واسطے؟ واہ بھئی۔ آج ہمیں ب۔ آئی۔ ایس نہیں جاتا۔ ارے بھئی لندن میں ٹیچرز کی جاب کے لئے فارم نہیں فل کرنا؟
> نہیں میں برٹش انفارمیشن نہیں جاؤں گی اور میں لندن بھی نہیں جاؤں گی۔

کیوں؟ کس لئے؟ کیا تم بھی مظاہرہ کر رہی ہو؟ فیروزہ نے مذاق اُڑایا۔"(۸)

اس طرح کے بے شمار واقعات اور آپس کی بحثیں اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ الطاف فاطمہ اپنی تاریخ کے آئینے میں آنے والے وقت کی آہٹ کو سن رہی تھیں۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ جلد پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ اخلاقیات اور اقدار کا ہو گا کہ اس اتھ پتھل میں جو شکست و ریخت ہو رہی ہے اس کا لازمی نتیجہ اخلاقیات اور اقدار کا زوال ہی ہو گا۔ اس حوالے سے تعلیم بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ یہ اقتباس دیکھیں:

"یہ صاحب زادے! ہوں ان کو آپ تعلیم یافتہ اور مرتب کہہ لیں مگر میں۔۔۔ میں تو پوچھوں گا کہ کہاں ہے وہ فلاسفر کہ ان حضرات کا دعوٰی تھا کہ تمام سماجی خرابیوں کو تعلیم سے دور کیا جا سکتا ہے اور اب وہ اسے کیا کہے گا کہ ان کی تعلیم اور اس کی بدولت ملی ہوئی یہ کرسی معاشرے کو خراب کر رہی ہے۔"(۹)

الطاف فاطمہ نے ہمیں آج تک کے اخلاقی زوال کے اسباب بتا دیئے ہیں۔ اس کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ معاشرے میں ہوس، لوٹ کھسوٹ اور مافیا کے کلچر کے بیج بوئے جا چکے تھے۔ اس لئے آج وہ فصل پک کر تیار ہو چکی ہے۔ اس کی خبر الطاف فاطمہ نے 'دید و ادید' میں ہمیں دے دی ہے۔

الطاف فاطمہ کے افسانوی مجموعوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے افسانے حقیقی زندگی کے عکاس ہیں۔ ان افسانوں کو وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر تخلیق کرتی ہیں۔ عام سماجی رویوں کے باعث رومانوی اور سماجی حقیقت نگاری میں وہ الگ مقام رکھتی ہیں۔

"گواہی آخرِ شب کی" میں ۳۳ افسانے شامل ہیں۔ اس کتاب میں افسانوں کے علاوہ ۸ شخصی خاکے اور یادوں پر مبنی مضامین بھی موجود ہیں۔

افسانے

۱۔ امن کی فاختائیں	۲۔ غیر ملکی لڑکی
۳۔ موجِ خون	۴۔ مرگِ محبت
۵۔ مداوا	۶۔ دمِ رخصت
۷۔ تعویذ	۸۔ آرزو جو خاک ہو گئی
۹۔ رسی کا بل	۱۰۔ اقرارِ شکست
۱۱۔ چاند گہن سے نکلیں گے	۱۲۔ زادِ سفر

۱۳۔ ادھوری کہانی
۱۴۔ تاؤ اور گٹھو
۱۵۔ دکھوں کا بیوپاری
۱۶۔ گواہی آخرِ شب کی
۱۷۔ لٹل جان
۱۸۔ نیون سائنز
۱۹۔ پھول اور پتھر
۲۰۔ کمندِ ہوا
۲۱۔ قصہ ایک میز کا
۲۲۔ مسئلہ امیرن کا
۲۳۔ پرانا بھیا
۲۴۔ اعتراف
۲۵۔ انجم ناز جماعت ہفتم
۲۶۔ سینئر سٹیزن
۲۷۔ چھوٹے آدمی
۲۸۔ مدن کی بوُا
۲۹۔ اُس کے شب و روز
۳۰۔ جَل ککڑی
۳۱۔ شیر دہان
۳۲۔ خود غرض
۳۳۔ عالیہ بڑی ہو گئی

یادیں اور شخصی خاکے

۱۔ چڑیاں اور بچے
۲۔ خزاں کے رنگ
۳۔ اختر بھائی
۴۔ مگر وہ ایک شاخِ نہالِ غم
۵۔ بڑے میاں
۶۔ مولاں روڑ
۷۔ رضی ترمذی، ایک مختصر شخصی خاکہ
۸۔ بندۂ رحمٰن

"گواہی آخرِ شب کی" جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہندوستان کی تاریخ کے حوالے سے افسانے اور یادیں ہیں۔ الطاف فاطمہ کے سارے فکشن میں تقسیمِ ہند سے پہلے کا آشوب اور ہجرت کا عمل مسلسل ایک بیانیے کی شکل میں ان کی دلچسپیوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اُن کے ہاں باقی لکھنے والوں خاص طور پر قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی اور انتظار حسین سے مختلف تجربات ہیں جو ان کی ذاتی زندگی کی دلچسپیوں اور معاشرتی تصورات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے ہاں شخصی اظہار اور تجربہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اُن کے اپنے خاندان اور اپنے شہر کی ثقافتی زندگی سے بہت اُنسیت ہونے کی وجہ سے ان کے افسانوں میں وہی گہما گہمی اور مکالمے کا انداز موجود ہے جیسا شخصی زندگی میں ہوا کرتا ہے۔

الطاف فاطمہ نے اپنے اس آخری مجموعے میں تینتیس افسانے اور آٹھ شخصی خاکے اور یادیں تحریر کی ہیں۔ یہ مجموعہ ان کی وفات کے وقت اشاعتی مراحل میں تھا اور ۲۰۱۸ء میں جمہوری پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ اس کا انتساب اپنے پڑھنے والوں کے نام ہے جو انہوں نے اپنی رخصت سے چند روز پہلے لکھا۔ ان افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہمیں یہ آگہی دیتا ہے کہ الطاف فاطمہ کی فکری اور احساساتی دنیا بہت وسیع ہے۔ عالمی سطح پر ان کا تجربہ دنیا کی صورتِ حال پر کئی موقعوں پر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ گویا وہ دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اس پر تبصرے کا حق بھی رکھتی ہیں۔ اس حوالے سے امریکیوں اور ان کے مخصوص کردار پر ایسے تبصرے کرتی ہیں۔

> ''دیکھنا تم۔، یہ امریکن ان پاکستانیوں کو خراب کر کے رہیں گے۔ بالکل تباہ کر رہے ہیں۔ بھلا اُن کا اور اِن کا کوئی جوڑ بھی ہو۔''
>
> ''پاکستانی تو امریکنوں کی بے تکلفی کو بہت پسند کرتے ہیں۔''
>
> ''بے وقوف جو ہیں، دیکھنا کیسے گھپلے پڑیں گے ان کے معاشرے میں"۔ ازابل کی آواز روز سے زیادہ کھردری اور مردانی تھی۔" بھئی یہ ہوئے، ہم لوگ ہوئے، سب کم حیثیت ملک ہیں۔ ہم کو ان امریکنوں سے زیادہ ربط وضبط رکھنے کی کیا ضرورت۔''(۱۰)

ہندوستانی سماج کی بے شمار جھلکیاں متنوع زاویوں کے ساتھ ان افسانوں میں الطاف فاطمہ کی بصیرت اور معلومات کے دائرے کا تعین کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ بدلتے ہوئے سماج کے ساتھ ہجرت در ہجرت کا عمل ہندوستان اور پاکستان کے الگ الگ ہونے کے بعد زیادہ سُرعت سے جاری رہا ہے۔ اس کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ایک مثال اس افسانے میں بے حد بھرپور طریقے سے آپ دیکھ سکتے ہیں۔ افسانہ "سینئر سٹیزن" میں اس عمل کو اس طرح بیان کیا گیا ہے

> ''اور جہاں آراء کو یہ طمانیت تھی کہ وہ بڑی آپا کو شک بھی نہ ہونے دے رہی ہیں کہ ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کے شوہر جاپان کی قید میں کس حرکت کی پاداش میں بند ہیں اور یہ کہ ان کی بیٹی شکاگو میں اپنے شوہر کے جبر میں کیسے دن گزارتی ہے اور ان کا بیٹا ان سے کے کر توتوں سے متنفر ہو کر کس طرح یونان میں جلاوطنی اختیار کر چکا ہے۔۔۔''(۱۱)

الطاف فاطمہ کے اس مجموعے کا نام "گواہی آخرِ شب کی" چونکہ قرۃ العین حیدر کے ناول "آخرِ شب کے ہم سفر" سے ملتا جلتا ہے تو یہ وہی آخرِ شب ہے جس کو قرۃ العین حیدر نے بھی استعارہ بنایا ہے۔ ہندوستان کی

تاریخ میں "آخرِ شب" ایک دور کے خاتمے اور نئی منزلوں کے شروع ہونے ہی کا قصہ ہے۔ یہ قصہ تو دور تک جاتا ہے۔ تقسیم کے بعد کا تمام فکشن کسی نہ کسی طرح انہی مسائل کے گرد گھومتا ہے جو ہجرت کے کئی مرحلوں پر پھیلا ہوا ہے۔ الطاف فاطمہ کے خاندان کو بھی ہجرت کے کئی مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ ان کا کنبہ لاہور آگیا تھا اور اس حوالے سے ان کے کئی افسانے موجود ہیں لیکن ایک افسانہ دو کرداروں پر مشتمل ہے جس کا نام "تاؤ اور گٹھو" ہے۔ یہ دونوں کردار گرداسپور سے ہجرت کر کے آتے ہیں لیکن ان کے وسیلے سے دراصل قصہ ہجرت کے مراحل سے متعلق ہے۔ مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے بالآخر یہ لوگ لاہور پہنچتے ہیں۔

> ''والٹن کے ساتھ ہی تو گوپال نگر کی بستی تھی۔ اس سے کچھ آگے جا کر بھابڑے کا علاقہ آجاتا تھا۔ انہیں تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ ان علاقوں میں نام کیا ہیں، بس اتنا پتہ تھا کہ سارے کا سارا لہور ہی ہے۔ ادھر ہی کسی تھاں کو پکڑ کر بیٹھے، آسمان کی طرف منہ اُٹھا اُٹھا کر دیکھتے، آدھا آدھا دن گزر جاتا۔ کھانے پینے کی فکر یوں نہ تھی کہ ان دنوں رب سوہنے نے لاہور والوں کے دلوں میں ان بِن بلائے مہمانوں کے لئے ایسی مامتا ڈال دی تھی کہ جس طرح بچہ مانگے نہ مانگے، ماں اس کی خبر گیری کو مستعد رہتی ہے۔۔۔''(۱۲)

الطاف فاطمہ لکھنؤ کی رہنے والی تھیں۔ ان کے خاندان کے گھر آج بھی وہاں پر موجود ہوں گے لیکن اس افسانے کے دونوں کردار پنجابی ہیں اس لئے تایا کو تاؤ لکھا گیا ہے اور جگہ جگہ پنجابی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں تاکہ دونوں کرداروں کے درد کو سمجھنے میں آسانی ہو۔۔ اس طرح کے تجربات اردو کے افسانوی ادب میں تقریباً ہر افسانہ نگار کے ہاں موجود ہیں۔ سب نے اپنے اپنے زاویے سے اس درد کو محسوس کیا ہے۔ اشفاق احمد کے "گڈریا" سے لے کر "تاؤ اور گٹھو" تک میں ہمیں یہی تجربہ محسوس ہو گا۔ انسانی رشتوں کی شکست وریخت ایک زمانے کا موضوع ضرور رہا ہے لیکن الطاف فاطمہ نے دونوں زمانے نہ صرف دیکھے ہیں بلکہ انہیں اچھی طرح زندگی میں برتا بھی ہے۔ ایک وہ زمانہ جب خاندان کی اکائی بغیر کسی نقصان کے سماج کی ضرورت ہوا کرتی تھی اور اس میں بڑے بڑے گھروں میں سب مل کر رہا کرتے تھے، اس طرح کے افسانے بھی اس مجموعے میں شامل ہیں اور وہ زمانہ بھی آتا ہے جب یہ رشتے آہستہ آہستہ تبدیل ہوتے ہوئے شکست وریخت کی زد میں آتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت یہ سلسلہ تیزی سے شروع ہونے لگتا ہے اور پھر ہجرت کی دُوریوں سے اس میں ایک خاص قسم کی سرد مہری ہر مقام پر محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہجرت نے انسانوں میں نفسانفسی کو جنم دیا تھا اور یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

ایک طویل افسانہ "انجم نار جماعت ہفتم" الطاف فاطمہ کے مسلامن اشرافیہ کے خاندانی مسائل کے حوالے سے گہرے مشاہدے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ جیسے کہ نام سے ظاہر ہے یہ ایک کم سن لڑکی سے تعلق رکھتا ہے جو ابھی ساتویں جماعت کی طالب علم ہے۔ اس لڑکی کے گھر سے بھاگ جانے سے لے کر تھانے میں ہونے والی کاروائی کے بیچ پورے خاندانی تانے بانے اور مسلمانوں کے درمیانی طبقے کے مسائل کو جس باریکی سے دیکھا گیا ہے وہ صرف الطاف فاطمہ ہی کے تجربے سے ممکن ہو سکتا تھا۔ ان کی نظر کہانی کے انجام یا واقعات پر زیادہ نہیں ہوتی اس کی نسبت اس تفصیل پر رہتی ہے جو کردار نگاری کی جزئیات سے تعلق رکھتی ہیں یا ماحول میں تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ انجم ناز مسلم اشرافیہ کی لڑکیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ہمیں یہ تاثر دے رہی ہیں کہ مسلمان گھرانوں کی لڑکیاں اپنے حقوق سے بے خبر نہیں ہیں وہ اپنے لئے کوئی بھی فیصلہ کر سکتی ہیں۔ اسی لئے تو بھاگنے کا مشکل فیصلہ کر لیتی ہے۔

> "وہ بڑا خوش شکل، خوش لباس اور بے فکرا لڑکا تھا۔ جو سچ پوچھو تو انجم ناز نے فضول ہی اپنا جوڑ اس سے ملا لیا تھا۔ اول تو وہ اس قدر الھڑ اور لاڈلے قسم کا واقع ہوا تھا کہ وہ اس قسم کے روگ پالنے ہی کے لائق نہ تھا۔ اس کو تو اپنی جان دیکھنے سے فرصت نہ تھی۔ کچھ کھالوں، پی لوں، کچھ سینما دیکھ لوں اور کچھ اپنے ٹھاٹ باٹ بنالوں۔ البتہ دو چار دفعہ یہ ضرور ہوا، جب یہ بہنیں سکول سے آتی ہوتیں تو وہ غیرتِ ناہید کو دیکھ کر چونک ضرور جاتا تھا۔"(۱۳)

الطاف فاطمہ کو ہم تہذیب کے سنگم پر ایک معتدل مزاج اور رواداری کی قدروں کی پاسداری کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک تو اسلاف کی تہذیب جن کا دامن انہوں نے تھام رکھا تھا۔ دوسری وہ تہذیب جو آنے والے وقت کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ انہوں نے دونوں تہذیبوں سے اچھی طرح نباہ کیا۔ کہیں بھی ان کا لہجہ کسی بھی حوالے سے طنزیہ یا استہزائیہ نہیں ہے کیونکہ وہ جدید تعلیم کے پہلوؤں سے آگاہ ہوتے ہوئے جانتی تھیں کہ مسلم اشرافیہ کے گھرانوں کے لئے آزمائش کے کس قسم کے مراحل سامنے آسکتے ہیں۔ اس لئے وہ جدید علوم و فنون کی نہ صرف بصیرت رکھتی تھیں، اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جدت کے اصولوں کو بھی ملحوظ رکھتی تھیں۔ جس طرح قرۃ العین حیدر کے ہاں زندگیا پنے تمام رنگوں کے ساتھ دکھائی دیتی ہے اسی طرح الطاف فاطمہ کے ہاں بھی جدید زندگی کی تمام سطحیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے افسانے "دکھوں کا بیوپاری" جس میں ادب شاعری اور فنونِ لطیفہ پر ایک مخصوص مزاج کے حامل کرداروں کی بحثیں شامل ہیں:

> "فن اور intellect۔۔۔ چھوڑو اِن باتوں کو۔ فن ہے کہاں، وہ تو کب کا مقید ہے نظریوں اور

افکار کے زنداں خانوں میں پایہ زنجیر۔ اور یہ intellect تو ایک طوائف ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی طوائف جو سیاستدانوں اور ان کے گٹھ جوڑوں کے اشاروں پر ناچتی اور ان کو جام پلاتی ہے۔' وہ زور سے ہنسا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی اور افسردگی کی بے پناہ چمک اٹھی۔"(۱۴)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ الطاف فاطمہ سیاسی بصیرت کے ساتھ جدید دنیا میں شہرت اور دولت حاصل کرنے والے طریقوں اور راستوں کو جانتی ہیں۔ اس سے ان کے افسانوں کا فکری دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔اسی حوالے سے آگے چل کے شاعری کے فن پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

"مگر شہریار! تم تو کہتے تھے کہ یہ تو تمہاری اس معرکتہ الآرا نظم کا عنوان ہے۔ فقط جس کی تخلیق کے خاطر تمہیں یہ صلاحیت عطا کی گئی ہے۔ اور یہ کہ تم تو کہتے تھے کہ ایک بڑا طویل عمل ہے کہ تمہارا کہنا تھا کہ پہلے تم فن کو اس کے اندھیرے زندانوں سے نکال کر اس کے پیروں کی بیڑیاں کاٹو گے۔"(۱۵)

دراصل افسانے کا جو عنوان ہے وہ اسی نظم سے لیا گیا ہے۔ شہریار کی نظم 'دکھوں کا بیوپاری' ہے جس میں اس نے آج کے دور کی سیاست اور سماجی منافقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔

"گواہی آخرِ شب کی" کے اکثر افسانے مختصر افسانوں کی صِنف پر پورا اُترتے ہیں۔ کہیں پر بھی بے جا تفصیلات اور ماحول سازی کی کوشش نہیں کی گئی۔ کہانی کہیں سے بھی اچانک شروع ہو جاتی ہے اور پھر اپنے ماحول اور کردار کو تخلیق کرتے ہوئے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ ان سب افسانوں کے موضوعات ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ اس سے الطاف فاطمہ کی وسعتِ نظر اور فکری پھیلاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کے مشاہدے کے ساتھ زندگی کے گہرے شعور اور تجربے نے انہیں بعض معمولی اور نظر انداز کئے گئے گوشوں کی طرف بھی متوجہ کر دیا ہے۔ مثلاً ایک افسانہ "شیر دہان" کتابوں کی ترسیل، اشاعت اور کاروبار سے متعلق ہے جس میں تعلیم اور ادب کے تعلق پر بھی بات کی گئی ہے۔

"صرف کورس ہی نہیں بکتا تھا یہاں، اس کی دکان میں کومکس اور کہانیاں، ہانس کرسچن کی کہانیوں کی رنگین تصویری کتابوں سے لے کر چارلس ڈکنز، ہارڈی، شیکسپیئر اور برنارڈ شا کے علاوہ شارلٹ، برونٹے، ڈیفنی دی ماریئر اور ڈینس رابنس تک دستیاب۔ اور میٹرک اور ایس سی کی لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی طرح ٹوٹ کر گرتی تھیں۔"(۱۶)

اسی طرح ایک اور افسانے "خزاں کے رنگ" میں بھی ایسے گھرانے کا ذکر ہے جسے کتابوں کے مطالعے اور ادب سے شغف ہے۔

> ''ہاں تو میں تو 'آئینۂ حیرت' کی بات کر رہی تھی۔ گھر کے جھنجھٹ سے فرصت پاتیں تو بار بار کے سنے افسانوں کو پھر پڑھتیں۔ پھر مسعود صاحب بار بار 'آئینۂ حیرت' منگوا بھیجتے۔ ایک دن بھیا نے اماں سے کہا، 'خالہ جان، ابا کہتے ہیں، بہن سے کہنا یہ کتابیں واپس نہیں دیں گے۔ وہ کہتے ہیں۔ یہ تو صحیفۂ آسمانی ہے۔''(۱۷)

اصل میں الطاف فاطمہ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور ان کے خاندان میں ماحول بھی ایسا ہی تھا۔ اس لئے ان کے کردار زیادہ تر اشرافیہ کے باذوق اور تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے بے جا چونکانے اور حیرت پیدا کرنے کے بجائے زندگی جیسے رواں دواں رہتی ہے ویسے ہی ان کے افسانے بھی زندگی کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ صلاحیت بہت کم لکھنے والوں کو ملتی ہے کہ جیسی زندگی تجربہ کریں ویسے ہی ان کا فن بھی اس سے مطابقت پیدا کرتا ہوا دکھائی دے۔

ایک افسانہ "گواہی آخرِ شب کی" سانحۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن کہیں بھی سیاسی جذباتیت اور تاریخ کے جبر سے کشمکش پیدا کرتی ہوئی صورتِ حال نہیں ہے۔ ایک خاندان کی کہانی ہے جس کا ایک بزرگ اس سانحہ میں اس خانہ جنگی اور جارحیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ الطاف فاطمہ یہاں کسی بھی سوچ یا نظریے کی حمایت میں افسانہ نہیں لکھ رہیں بلکہ معروضی حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال اُن کے پیشِ نظر اہمیت رکھتی ہے۔

> ''زبیر اس دوران کئی بار ان سے 'سقوطِ مشرقی پاکستان' سے متعلق ان سچائیوں کے بارے میں سننا چاہتا تھا۔۔۔ اتنے ماہ و سال اور اتنی برساتوں کے گزرنے کے بعد، بہت سے سچائیوں کے بارے میں جاننے والوں نے اس حقیقت کو دبا دینے میں ہی مصلحت سمجھی تھی اور اگر کسی نے کبھی اس کے بارے میں لب کھولنے کی جرأت بھی کی تو ایسے دبے دبے محتاط انداز میں کہ جن کو پڑھنے والی نئی نسلوں کو کچھ زیادہ ہی شرمساری اور کنفیوژن سے اس درجے دوچار کر دیا کہ وہ اپنی پوری قوم کو جرمن نازیوں سے بھی بڑھ کر ظالم اور جابر سمجھنے پر مجبور ہوئے۔''(۱۸)

یہ مجموعہ الطاف فاطمہ کے آخری دور سے تعلق رکھتا ہے جس میں جدید ٹیکنالوجی ہماری زندگی کا حصہ بن کر ہمارے رویوں پر غالب آچکی ہے۔ اس مجموعے میں "یادیں اور شخصی خاکے" کے عنوان سے کچھ مضامین بھی شامل ہیں۔ انہیں خاکے کہنے میں ذرا تامل ہوتا ہے کہ یہ خاندان کے بزرگوں اور دوستوں کی زندگیوں کا احوال زیادہ محسوس ہوتا ہے اور شخصی خاکوں کا فن اس میں کم محسوس ہوا ہے۔ یہ یادیں بھی افسانوی نوعیت کی حامل ہیں۔ اس میں ان کی یادیں اپنی والدہ سیدہ ممتاز جہاں بیگم، ماموں سید رفیق حسین، اختر حسین رائے پوری، رضی ترمذی، شاہس احمد دہلوی اور چند دیگر شخصیات سے وابستہ ہیں۔ الطاف فاطمہ کا بیانیہ ان کی ذات اور شخصیت کا عکس محسوس ہوتا ہے۔ انہیں سمجھنے کے لئے "گواہی آخرِ شب کی" بے حد اہم تصنیف ہے۔ الطاف فاطمہ کے مزاج اور ان کے تصورِ فن کی آگہی کے لئے یہ کتاب بے حد اہمیت رکھتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ الطاف فاطمہ، سپاس نامہ بشمولہ دید وادید، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص:۸

۲۔ ایضاً، ص:۸

۳۔ الطاف فاطمہ، چیچہ کے بغیر بشمولہ دید وادید، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص:۹۹

۴۔ الطاف فاطمہ، گئے دنوں کا سراغ بشمولہ دید وادید، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص:۲۰۴

۵۔ الطاف فاطمہ، بسیرے کی وہ شب تھی بشمولہ دید وادید، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص:۲۲۷

۶۔ الطاف فاطمہ، گئے دنوں کا سراغ بشمولہ دید وادید، ص:۱۹۴

۷۔ الطاف فاطمہ، سوم رس بشمولہ دید وادید، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص:۸۶

۸۔ الطاف فاطمہ، صبر بشمولہ دید وادید، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۲۴۳

۹۔ ایضاً

۱۰۔ الطاف فاطمہ، دمِ رخصت بشمولہ گواہی آخرِ شب کی، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص:۶۵

۱۱۔ الطاف فاطمہ، سینئر سٹیزن بشمولہ گواہی آخرِ شب کی، ۲۰۱۸ء، ص:۲۸۳

۱۲۔ الطاف فاطمہ، تاؤ اور گٹھو بشمولہ گواہی آخرِ شب کی، ۲۰۱۸ء، ص:۱۴۵

۱۳۔ الطاف فاطمہ، انجم ناز جماعت ہفتم بشمولہ گواہی آخرِ شب کی، ۲۰۱۸ء، ص:۲۷۰

۱۴۔ الطاف فاطمہ، دکھوں کا بیوپاری بشمولہ گواہی آخرِ شب کی، ۲۰۱۸ء، ص:۱۶۰

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۶۱

۱۶۔ الطاف فاطمہ، شیر دہان بشمولہ گواہی آخرِ شب کی، ۲۰۱۸ء، ص:۳۳۳

۱۷۔ الطاف فاطمہ، خزاں کے رنگ بشمولہ گواہی آخرِ شب کی، ۲۰۱۸ء، ص:۳۷۳

۱۸۔ الطاف فاطمہ، گواہی آخرِ شب کی، ۲۰۱۸ء، ص:۱۷۳